

قفسِ رنگ

غیاثِ صدیقی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

اشاعت اول ۱۹۷۶ء

ایک ہزار

بہ تعاون ادبی ٹرسٹ، حیدرآباد و ایچ، ای، ایچ، دی نظامس ٹرسٹ
 کتابت : محمد ولی الدین خوشنویس
 طباعت : اکسل فائن آرٹ، جامع مسجد
 محبوب چوک، حیدرآباد (اے پی)

قیمت : پندرہ روپے سکہ ہند^{۱۵}

ناشر: انجمن ترقی پسند مصنفین حیدرآباد

_____ ملنے کے پتے _____

• اردو اکیڈمی آندھرا پردیش، روہڑی، جی پی

• غیاث صدیقی، توسط محمد صدیقی :-

مجاہد منزل، کالی گمان (۲۲۲-۵-۲۲)

حیدرآباد نمبر ۲، ۵۰۰۰۰، اے پی

انتساب

اُردو کے دو سچے خدمت گزاروں

جناب عابد علی خاں — اور

جناب محبوب حسین حبسگر کے نام

جن کی بے مثال دوستی نے اُردو کو بہت کچھ دیا ہے

غیاث صدیقی

خاکِ دکن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیتا ہے

مُری کفِ خاکستر و بلبیل، قفسِ رنگ

اے نالہ، نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے۔

(غالب)

ترتیب

سو سال پہلے آقباسر از آبِ حیات ۱۳ تا ۹

غزلیں ۱۳ تا ۲۴

آنکھ سے چھوٹا کہاں جب ہاتھ سے دیکھانہ تھا ۱۲

جتنے سائے تھے اُسی آواز کے پیچھے گئے ۱۸/۱۷

گلی گلی میں اُسی رات کا اُجالا ہے ۱۹

پاؤں تر خنی ہیں مگر پہلو میں بیا کھی نہیں ۲۱، ۲۰

اپنے گھر میں آئے ہیں تو دے کے دستک لے ہیں ۲۲

تمہارے حسن کو پلکوں سے بس سراہ سکا ۲۳

کیٹں شہ رگیں، برگ گل سے، یہی نا ۲۴

نظمیں

۲۵ تا ۲۰

۲۹/۲۶

حسینی آنکھیں

۳۱/۳۰

انجیر کا پتا

۳۳/۳۲

صد ہے جلوہ برقی فنا

۳۴

یا کیلیج

۳۵

گیت دیں

۳۸/۳۶

لکیر مت پیو

۳۹

فنا عت

۴۰

احساس کمتری

۴۱ تا ۳۸

غزلیں

۴۳/۴۲

ازل کی جبین پر ملے کاف تون

۴۴

مجھے گھیر لیں گے سوالوں کے جال

۴۶/۴۵

ہو کی جھیل میں صدیوں کے بیج ڈال گیا

۴۷

غیر کے ہاتھ کٹے خون ہمارا نکلا

۴۸

آرزو وہ جو بے لباس رہے

دروں خانہ

۷۱ تا ۷۹

۵۲/۵۱

لوری

۵۲/۵۳

..... اور دہ نعموں پر مرتی تھی

۵۶/۵۵

بھیکا انا

۵۸/۵۷

سوئی اور گلاب

۵۹

تھکن

۶۲/۶۰

انمول انگوٹھی

۶۶/۶۵

چارشتیں

۷۱/۶۷

بوڑھا رامیا

ترجے ۱۱۱ تا ۱۱۳

یروشلم کے نئے عربی — ایک عراقی شاعر ۸۷/۸۵
وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد انگیزی۔ راجکاری اندر دیوی دھن راگیر
۱-۱/۸۸

تم — تلگو۔ جی شیشندر شرما ۱۱۱/۱۰۲

نذر وطن ۱۱۳ تا ۱۲۸

اندراجیوتی ۱۱۵/۱۱۴

آزادی وطن ۱۱۸/۱۱۶

بانڈو لیبر ۱۲۰/۱۱۹

حیات مساوات ۱۲۲/۱۲۱

ایک خواب — ایک حقیقت ۱۲۴/۱۲۳

پٹنہ جو ایک شہر تھا بھارت میں انتخاب ۱۲۷/۱۲۵

مخدوم ۱۲۸

غیاث صدیقی نئے عہد کے مسائل اور احساسات کو نئی زبان اور نیا بیان عطا کرنے کی قدرت کے ساتھ ساتھ کلاسیکی نفاست اور فنی نزاکت کا پورا شعور رکھتے ہیں۔

اس لیے ان کا قلم غزل اور آزاد نظم دونوں میدانوں میں جولانیاں دکھاتا ہے۔ میں نے ان کا کلام پڑھا ہے اور وہ شاعر کی خوش فکری اور خوش بیانی پر شاید بے اُس میں ایک ذہنی وسعت اور بالیدگی ہے۔ مغربی ادب سے ذوق و شوق نے ان کے فن پر اور بھی جلا کر دی ہے۔ میں ان کے نئے مجموعوں کا منتظر اور ان کا خیر مقدم کرنے کے لیے چشم براہ ہوں۔

علی سردار جعفری

میدر آباد

۲۰ اکتوبر ۱۹۷۶ء

غیاث شعر و ادب کا بڑا رچا ہوا ذوق رکھتے ہیں۔ اتفاق سے انھیں استاد داغ کے سلسلہ جانشینی کے آخری تاجدار صفی اور تنگ آبادی کا تلمذ نصیب ہوا۔ یہ اسی کا اثر ہے کہ وہ علم معنی و بیان پر غیر معمولی دسترس رکھتے ہیں۔ سنگلاخ زمین ہو کہ شگفتہ رواں بحریں ہوں کہ ادق ان کی گردت میں فرق نہیں آتا۔ ان سے زبان کی یا فن کی کوئی اصولی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی۔ کثرت مطالعہ ان کا خاص وصف ہے۔ وہ قدیم اور جدید تمام تحریکوں، روایات اور تجربوں سے باخبر ہیں۔ وہ ہر چمن کے خوشہ چیں ہیں لیکن اپنی انفرادیت سے دستبردار نہیں ہوتے ان کے کلام میں زبان و بیان کی دلآویزی، انداز کا بائپکن بھی ہے اور حقیقتوں کا نیا فرمان بھی۔ وہ غزلوں اور نظموں کے لکھنے پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ وہ غم ذات کا نوحہ سناتے ہوئے بھی رجائیت ذہنی کو نہیں کھوتے۔ سماجی مسائل کی الجھنوں کا ذکر کرنے سے گھبراتے نہیں۔ وہ نہ صرف آنکھیں کھول کر دنیا دیکھتے ہیں بلکہ مصوّر کی نظر کا رنگ بھی مہرتے ہیں اور شاعرانہ خوش الحانی سے اس کیفیت کو ادا کر سکتے ہیں۔ وہ الفاظ کے انتخاب میں جوہری کی سی نظر رکھتے ہیں۔ ان کے موسیقی سے آشنا کان صوتی آہنگ کا لطیف احساس رکھتے ہیں اسی لیے لہجے کی شرافت و شائستگی، آواز کی مٹھاس، تنخ بات کو بھی گوارا بنا دیتی ہے۔

ڈاکٹر زینت ساجدہ

غیاث صدیقی حیدرآباد کے شعرا میں کئی حیثیتوں سے امتیاز رکھتے ہیں۔ وہ کلاسیکی اسالیب پر جتنی قدرت رکھتے ہیں انھیں جدید طرز بیان پر بھی اسی قدر عبور حاصل ہے۔ وہ نظم کہنے کا جیسا سلیقہ رکھتے ہیں، روایت کے احترام کے ساتھ جدید لہجے کو غزل میں سمونے پر بھی دیسے ہی قادر ہیں۔

ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے شاعری کے ترجمے پر بھی توجہ کی ہے۔ ترجمے کے میدان میں ان کی کامیابی اس سے ظاہر ہے کہ ان کے ترجموں پر اصل کا گماں گزرتا ہے۔ وہ شاعر کی روح کے ساتھ اس کے لہجے مخصوص تہذیبی ماحول حتیٰ کہ اس کے نجی علائم کو بھی دیانت اور خلّاقیت کے ساتھ ترجمے میں منتقل کر سکتے ہیں۔ انگریزی، عربی اور تلگو زبانوں سے انھوں نے جو ترجمے کیے ہیں، وہ اس کا ثبوت ہیں۔

”قص رنگ“ ان کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کی طبع زاد نظموں، غزلوں کا ایک مجموعہ ”آواز کا رنگ“ اور ”نیلَم کے پنکھ“ تلگو نظموں کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ ”قص رنگ“ اپنی غزلوں انفرادیت کے لحاظ سے خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ غیاث صدیقی کی غزلوں میں جو رنگ و آہنگ ہے، وہ جدید ہوتے ہوئے غزلوں کی کلاسیکیت اور تغزل کا ورثہ دار بھی ہے۔ ”آواز کا رنگ“ ان کے تخلیقی سفر کا ابتدائیہ تھا تو ”قص رنگ“ اردو شاعری، خصوصاً غزل کے امکانات کا روشن اشاریہ ہے۔

ڈاکٹر وحید اختر

شعبہ فلسفہ - مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نیلَم کے پنکھ : شیشندر شرما، ترجمہ : غیاث صدیقی

غیاث صدیقی کے تراجم بھی اردو کی نئی شاعری کا مزاج رکھتے ہیں یقین ہے کہ شیشندر شرما کی شاعری میں وہ تمام عناصر کم و بیش موجود ہوں گے جو جدید ہندوستانی شاعری کی امتیازی صفات ہیں۔ لیکن یہی ترجمے اگر کسی پرانے خیال کے شاعر نے کیے ہوتے تو وہ عناصر دب جلتے یا مسخ ہو جلتے۔ موجودہ صورت میں ان نظموں کا مطالعہ ایک خوشگوار تجربہ ہے۔

میرے ذہن کی واویلوں کو سانس لیتے زمردوں کی مانند سرسبز رہنا ہے (سوغات)
 بگڑ چٹک کی مانند بویاں اڑ رہی ہیں (طوفان)
 ایک نازک خواب ہنس کی طرح بہنے لگا ہے (تم)

چاندنی کی کرنوں سے بنا ہوا ہمارا تاروں کے ہیروں سے بنے ہوئے ہمارے تیرے منظر ہیں (شبنم کے موتی)
 ان تراجم کو شائع کر کے غیاث صدیقی ہم سب کے شکریے کے مستحق ہو گئے ہیں۔

شمس الرحمن فاروقی

سوال پہلے

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد مرحوم نے آپ حیات میں قریباً سو برس قبل لکھا تھا ”ہمارے بزرگوں میں سے دلی میں اول مرزا رفیع سودا پھر شیخ ابراہیم ذوق نے زبان کی پاکیزگی، الفاظ کی شستگی اور ترکیب کی چستی سے کلام میں خوب زور پیدا کیا۔ میر تقی میر اور خواجہ میر درد نے زار حالی، افسردہ دلی، دنیا سے بیزاری کے مضامین کو خوب ادا کیا۔ غالب نے بعض مواقع پر ان کی عمدہ پیروی کی مگر معنی آفرینی کے عاشق تھے اور زیادہ تر توجہ ان کی فارسی پر رہی، اس لئے اُردو میں غالباً صاف اشعار کی تعداد سود سے شعر سے آگے نہ نکلی۔ جبرائیل نے عاشق و معشوق کے معاملات اور دونوں کے دلی خیالات کو نہایت خوبی اور شوخی سے بیان کیا۔ مومن خاں نے باوجود مشکل پسندی کے پیروی کی۔ مکھنویں شیخ امام بخش ناسخ اور

خواجہ حیدر علی آتش، رند، صبا، وزیر نے شاعری کا حق ادا کیا۔ مگر پھر خیال کرو کہ فقط زبانی طوطا مسینا بنانے سے حاصل کیا۔ جو شاعری ہمارا ہر قسم کا مطلب اور ہمارے دل کا ہر ایک ارمان پورا نہ نکال سکے گویا ایک ٹوٹا قلم ہے جس سے پورا حرف نہ نکل سکے دارالخلافت دہلی جو کہ انشاء اور اردو شاعری کے لئے دارالضرب تھا، وہاں ذوق اور غالب نے رسمی شاعری پر خاتمہ کیا۔ لکھنؤ میں آتش و ناسخ سے شروع ہو کر رند، وزیر اور صبا تک سلسلہ جاری رہا۔ ایک زمانہ میں یہ بات مشہور تھی کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویا مرثیہ خواں۔ لیکن لکھنؤ میں ان دونوں شاخوں کے صاحب کمال بھی ایسے ہوئے کہ دونوں کو رونق دے دی۔ اسی اعتبار سے کہہ سکتے ہیں، کہ میر انیس اور مرزا دبیر خاتمہ شعرائے اردو کا ہیں۔ اور چونکہ اس فن کے صاحب کمال کا پیدا ہونا نہایت درجہ کی آسودگی اور زمانہ کی قدر دانی اور متعدد سامانوں پر منحصر ہے اور اب زمانہ کا رنگ اس کے خلاف ہے۔ اس لئے ہندوستان کو اس شاعری کی ترقی اور ایسے شعراء کے پیدا ہونے سے بالکل مایوس ہو جانا چاہئے البتہ کوئی نیا فیشن نکلے پھر اس میں خدا جانے کیا کیا کمال ہوں اور کون کون اہل کمال ہوں۔

خاتمہ کلام میں عقل کے نجومی سے سوال ہوا کہ اس شاعری کا ستارہ جو نحوست زوال میں آگیا ہے کبھی اوج اقبال پر بھی طلوع کرے گا یا نہیں؟ جواب ملا کہ نہیں۔ پوچھا گیا کہ سبب؟ جواب ملا کہ حکام وقت کی یہ زبان نہیں، نہ ان کے کار آمد ہے۔ اسی لئے وہ اس کے قدردان نہیں، نہ وہ اسے جانتے ہیں نہ اس کے جاننے کو فخر جانتے ہیں۔ وہاں (انگلستان) سے ہمارے شعراء کو جھوٹے خوشامدی کا خطاب بلا ہوا ہے۔ اچھا، یا قسمت یا نصیب۔ جن لوگوں کے کلام ہماری زبان کے لئے سند سمجھے جاتے تھے،

ان کی تو یہ عزت ہوئی۔ اب اس نیم جان مردہ کے رونے والے چند بڈھے رہے جن کی دردناک آوازیں کبھی کبھی آہِ سرد کے سروں میں بلند ہو کر سینوں میں رہ جاتی ہیں۔ کبھی وہ دل آسودہ ہوتے ہیں تو ایک مشاعرہ کر کے مل بیٹھتے ہیں اور آپس ہی میں ایک دوسرے کی تعریفیں کر کے جی خوش کر لیتے ہیں۔ شاعر غریب اپنے بزرگوں کی قربی قائم رکھنے کو اتنی ہی تعریف پر قناعت کر لیں مگر پیٹ کو کیا کریں۔ یہ دوزخ تو بہت سی تعریف سے بھی نہیں بھرتا۔

پھر سوال ہوا کہ کوئی ایسی تدبیر ہے جس سے اس کے دن پھریں اور پھر ہماری نظم کا باغ لہلہاتا نظر آئے؟ جواب ملا کہ ہاں ہمت و تدبیر کو خدا نے بڑی برکت دی ہے۔ صورت یہی ہے کہ ایشیا میں ایسے کماؤں کی رونق حکام کی توجہ سے ہوتی ہے شاعروں کو چاہئے کہ اسے حاکموں کے کارآمدیاں کی پسند کے قابل بنائیں۔ ایسا کریں گے تو شعر کہنے والوں کو کچھ فائدہ ہوگا۔ جس قدر فائدہ ہوگا اسی قدر چرچا زیادہ ہوگا، اسی قدر ذہن و فکر جو دت کریں گے اور دلچسپ ایجاد اور خوش نما اختراع کر نکالیں گے اسی کو ترقی کہتے ہیں۔

یہ تو تم نے دیکھ لیا کہ اردو میں جو سرمایہ انشا پر دازی کا ہے فارسی کی بدلت ہے۔ قدمائے فادس ہر قسم کے مضامین سے لطف اٹھاتے تھے۔ متاخرین فقط غزل میں منحصر ہو گئے۔ ذی استعداد قصیدے بھی کہتے رہے۔ اردو والوں نے بھی آسان کام سمجھ کر اور عوام پسندی کو غرض ٹھہرا کر حسن و عشق وغیرہ کے مضامین کو لیا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ جو کچھ کیا بہت خوب کیا لیکن وہ مضمون اس قدر مستعمل ہو گئے کہ سنتے سنتے کان تھک گئے۔ وہی مقررہ باتیں، کہیں ہم لفظوں کو پس و پیش کرتے ہیں کہیں

ادل بدل کرتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں گویا کھائے ہوئے بلکہ اوروں کے چبائے ہوئے نوالے ہیں انھیں کو چباتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ خیال کرو اس میں کیا مزہ رہا۔ حسن و عشق سبحان اللہ بہت خوب لیکن تا بہ کے؟ حور ہو یا پری گلے کا ہار ہو جائے تو اجیرن ہو جاتی ہے۔ حسن و عشق سے کہاں تک جی نہ گھبرائے اور اب تو وہ بھی سو برس کی بڑھیا ہو گئی۔

ایک دشواری یہ بھی ہے کہ ان خیالات کے ادا کرنے کے لئے ہمارے بزرگ الفاظ اور معانی اور استعاروں اور تشبیہوں کے ذخیرے تیار کر گئے ہیں اور وہ اس قدر رواں ہو گئے ہیں کہ ہر شخص تھوڑے فکر سے کچھ نہ کچھ کہہ لیتا ہے۔ اور اگر خیال نظم کرنا چاہے تو ویسا سامان نہیں۔ البتہ ذی استعداد مشاق چاہیں تو کر بھی سکتے ہیں لیکن کم بخت حسن و عشق کے مضمون اس کے خط و خال، بہار و گلزار کے الفاظ ان کی زبان و دہان میں رچے ہوئے ہیں۔ اگر کچھ کہنا چاہیں تو اول اُسے بھلا لیں پھر اُس کے مناسب مقام، ویسے ہی نرالے استعارے، نئی تشبیہیں، انوکھی ترکیبیں اور لفظوں کی عمدہ تراشیں پیدا کریں اور بڑی عرق ریزی اور جانکاہی کا کام ہے۔ بے بہتی جو ہماری قوم پر حاکم یا اختیار بنی ہوئی ہے اسے اس سے زیادہ روکنے کا موقع کہاں مل سکتا ہے۔

اس اتفاقی معاملہ نے اور تو جو کیا سو کیا بڑی قباحت یہ پیدا کی کہ ارباب زمانہ نے متفق لفظ کہہ دیا کہ اردو نظم مضامین عاشقانہ ہی کہہ سکتی ہے، اسے ہر ایک مضمون کے ادا کرنے کی طاقت اور قیامت بالکل نہیں اور یہ ایک بڑا داغ ہے جو ہماری قومی زبان کے دامن پر لگا ہے۔ سوچتا ہوں کہ اسے کون دھوئے اور کیونکر دھوئے۔ ہاں یہ کام ہمارے نوجوانوں کا ہے جو کشورِ علم میں مشرقی اور مغربی دونوں دریاؤں کے کناروں پر قابض ہو گئے ہیں۔ ان کی ہمت آبیاری کرے گی، دونوں کناروں سے پانی لائے گی اور اس داغ کو دھوئے گی بلکہ قوم کے دامن کو موتیوں سے بھر دے گی۔

غزلیں

آنکھ سے چھوٹا کہاں جب ہاتھ سے دیکھا نہ تھا
 جتنے سائے تھے اُسی آواز کے سمجھ گئے
 پاؤں زخمی ہیں مگر پہلو میں بیٹا کھی نہیں
 گلی گلی میں اُسی رات کا اُجالا ہے
 اپنے گھر میں آئے ہیں تو دے کے دستک آئے ہیں
 تمہارے حسن کو پلکوں سے بس سہراہ سکا

ہنسی لبوں پہ ملی، احتجاج آنکھوں میں
 کہ لب کُشا تھا کسی کا مزاج آنکھوں میں
 پلک پلک پہ مجھے تھا گمان نشتر کا
 گرم کے پردے میں کیا شے تھی آج آنکھوں میں
 دکن میں اپنے یہی درد کے اُجالے ہیں
 شکستہ دل میں ہیں مخدوم راج آنکھوں میں
 خزانے غم کے سمندر ہیں ناؤ میں، جیسے
 دلوں نے جمع کیا ہے خراج آنکھوں میں
 دراز جب ہوا دست سوال ہاتھ کُشا
 وہ تشنگی ہے کہ آنسو ہیں آج آنکھوں میں
 غیاث تم نے دکن کے صفی سے کیا سیکھا
 کہ پھر رہے ہیں وٹی و سر آج آنکھوں میں

۱۔ مخدوم محی الدین ۲۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ۳۔ صفی اورنگ آبادی

۴۔ وٹی اورنگ آبادی ۵۔ سر آج اورنگ آبادی



اتفاقاً آگیا تھا، خود سے وہ آیا نہ تھا
کس طرح اُس کو مناتا میں کہ وہ روٹھانہ تھا

دل نے وردی پھینک دی اور ہار اپنی مان لی
مصلحت کہتی رہی ایسا نہ تھا، ایسا نہ تھا

پھول دریا پار تھا اور آرزو بے دست و پا
آنکھ سے چھوٹا کہاں جب ہاتھ سے دیکھانہ تھا

اور وہ بھی زہر کھاکر سو گئی تھی سیج پر
کوئی افسانہ یقیناً تھا مگر اتنا نہ تھا

ایک سایہ سامنے قاتل کے آکر جھک گیا
قتل ہونے کے لئے آیا تھا وہ پہلانا تھا

پھر ہوا ایسا کہ پُرزے کشتیوں کے اڑ گئے
لوٹ کر ساحل پہ تنہا، ناخدا سویا نہ تھا

زلیست ہونٹوں پر سجائے چھولیا ناگن کا پھین
موت کو چکھ کر کہا اُس نے مزا کر وانا تھا

جھوٹ جب بھی بولتا تھا خود تڑپ اٹھتا تھا وہ
دل کی حالت کون جانے دل میں پچھو تھا نہ تھا

صبح کی بانہوں میں جاگا تھا میں کچی نیند سے
مست آنکھوں میں تری کا جل ابھی پھیلا نہ تھا

جسم کی نیکی سے جنت ناپتے تھے رات دن
شیخ صاحب کا یہی انداز تو بچکانہ تھا

میں نے اک سایہ سا دیکھا تھا لبِ دریا غیاث
ساتھ اس کے ہو گیا اور نام تک پوچھا نہ تھا



گیسوؤں میں نکہتوں کے قافلے لوٹے گئے
ہونٹ تک شعلے گئے رُخسار تک شعلے گئے

صرف اُس کے قہقہے ہیں منجر اس جھیل میں
سچ بتا اے ماہ، کتنے قافلے آئے گئے

چاند نکلا اور ہم دونوں بہاروں سے ملے
رات کے مُنہ سے نوالے ہجر کے چھینے گئے

ریت پیاسی تھی، شاعروں کی دُعا کرنے لگی
اُڑ گئے دریا، صدف بھی دھوپ میں سینکے گئے

ذہن میں پر چھائیاں ہیں، دل میں کچھ جلوں کی گونج
کس کو آنکھوں سے لگاؤں سا لے خط وہ لے گئے

ایک نغمہ لوٹ جاتا ہے اُفق کے شہر میں
بختے سائے تھے اُسی آواز کے پیچھے گئے

سُرخیاں پڑھ کر تجھے پہچاننے والے یہاں
کچھ تو سُولی پر چڑھے کچھ آگ میں پھینکے گئے

باغباں نے رنگ و بو سے اپنا دامن بھر لیا
ہم غیاث اب رہ گئے ہیں وہ جو تھے اچھے گئے



عجیب بات ہے یارب درخت سُکھا ہے
ہر ایک شاخ پہ بیٹھا ہوا پرند ا ہے

ہے آرزو کہ مری فِکر کی دھنک میں بسو
تمہارا قُرب تو روندی ہوئی تمنا ہے

نہ رنگ جینے کا کوئی، نہ سوچنے کے خطوط
وہ شخص کیا ہے دُھند لکا دکھائی دیتا ہے

میں کب سے یاد نہ آیا تجھے، بستا سچ سچ
جنا کا رنگ ستھیلی میں کب سے پھیکا ہے

سنا، تم آئے تھے جس رات میری نگری میں
گلی گلی میں اُسی رات کا اُجالا ہے

شعورِ غم کو بھی مہمیز مانتا ہوں مگر
ملا تو غم بھی اپا ہج ملا، تماشا ہے



دن میں مرنا مجرم ہے تو شب بھی زہریلی نہیں
کس توقع پر جئیں اب زلف بھی ڈستی نہیں

اُس نے چاہا تھا کہانی لکھ کے ہو جائے اُمَر
خود کہانی ہو گیا، تحکیر تک سُکھی نہیں

با نہیں منزل کی کھلی ہیں، مرحبا کا شور ہے
پاؤں زخمی ہیں مگر پہلو میں بیسا کھی نہیں

موم کے دو ڈھیر ہیں اس کا پنچ کے فانوس میں
دو دلوں کی داستاں ہے تم نے پہچانی نہیں

پیاسی بے زینہ چٹانیں اور پتی ریت ہے
آبلہ پا کے لئے دریا نہیں کشتی نہیں

وہ کفِ دریا نہیں پہنچا ابھی دہلیز تک
بھینی بھینی کڑوی خوشبو صحن میں پھیلی نہیں

انکساری نے سرازیر کی رکھ لی آبرو
زیست کو سب کچھ دیا، غربت مگر بیچی نہیں

کس کا خنجر، کس کا سینہ، سائے تک میہم غیاث
یہ روایت آنکھ والوں نے کبھی لکھی نہیں



کتنے ایسے لوگ ہیں جو آئینہ کہلائے ہیں
آئینے میں اپنی صورت دیکھ کے شرمائے ہیں

خود شناسی کو کچل کر سُرخ رُو وہ ہو گیا
ہم تو اپنے آپ سے مل کر بہت پچھتائے ہیں

ہو کے دُنیا میں سُبک اُترے ہم اپنے جسم میں
اپنے گھر میں آئے ہیں تو دے کے دستک آئے ہیں

برف نگھلی اُس کے ساغریں تو آنکھیں نم ہوئیں
سارے قصے بے ثباتی کے اُسے یاد آئے ہیں

سطحِ دریا پر تو آنکھیں پھوٹتی تھیں، دوستو
دُوب کر ساحل پہ نکلے ہیں تو موتی لائے ہیں



تمام عمر حریفوں سے بس نباہ سکا
مرے جیب، تجھے ٹوٹ کر نہ چاہ سکا

پناہِ قُرب کی خوشبو میں منجمد تھے لفظ
تمہارے حُسن کو پلکوں سے بس سہراہ سکا

یہ کیسا خواب تھا شہ رگ نے آگ اُگلی تھی
بس اتنا یاد ہے مقتل میں، میں کراہ سکا

نہ مل سکی تجھے دھکرتی پہ لکشمی اے دل
سُرسُوتی سے خلاؤں میں تو نباہ سکا

نہیں تھا واقفِ گُلبانگ، عیشِ گُلِ چینی
حنائی ہاتھ میں چیخا، نہ گُل کراہ سکا

غیاث میں بھی تضادوں کا شہر ہوں، دیکھو
میں اپنے آپ سے کس کس طرح نباہ سکا



جزیروں میں بسنا، سرابوں کو پسینا
 یہ کیسا زمانہ، نہ مرنا نہ جینا
 روایت بھی سُن لی، ترقی بھی دیکھی،
 وہ سینہ بہ سینہ، یہ زمین بہ زمین
 یہ سب ہم سمجھتے ہیں، تم لب نہ کھولو
 کٹھیں شہ رگین، برگ گل سے، یہی نا

نظمیں

حسینی آنکھیں ... ہزاروں ہونٹ اک دستِ مبارک پر ٹھکے تھے
 انجیر کا پتا ... نگاہوں پر لبوں پر اور سوچوں پر بھی پابندی نہیں تھی
 صدا ہے جلوۂ برقِ فنا ... آوازوں کی دھنک بچھی تھی
 یا کبیکج ... میرے فن کی لاش کہاں پہچانیں گے

گیندیں ... سونا چاندی، تانبا، پیستل، لکڑی، کاٹن، ریشم کی
 لکیر مت پیٹو ... کلی کی چنچیں، گلوں کی سانسیں، صریرِ خامہ میں قید کر کے
 قناعت؟ ... میں اپنی اس عظمت پر کتنا قانع ہوں
 احساس کمتری ... کمزوروں کے ہاتھوں کو اور ماتھوں کو تنگت رہتا ہے

حُسنِ آنکھیں

گواہی دو کی بس تھی

لیکن اتنے خط

ہزاروں لب

ہزاروں دستخط

جہادِ ید

جہادِ نطق و دل پر غالب آیا

لہو کی پیش کش کی

سرفروشوں نے، گواہوں نے

حسینی شاہدوں نے
 ”جسے نانِ جویں بخشی تھی رب نے
 اُسے بازوئے حیدرؑ بھی ملا تھا“

ہزاروں ہونٹ

اک دستِ مبارک پر جھکے تھے
 مدینے سے نقوشِ پازمین کر بلا تک
 خون میں ڈوبے ہوئے آئینے، جیسے

ہزاروں تیر چھوٹے

زمین کے ہونٹ پھیلے

بہتر شہِ رگوں نے آگ اُگلی
 سوا نیزے پہ تھا مہرِ رسالت
 فضا چُپ تھی
 خموشی

بے کراں اندھی خموشی

یہ کیسا قتل تھا
قاتل بھی دل میں کٹتے جاتے تھے
خموشی کے یہ سائے
نطق بن کر

یا پر پرواز بن کر
شام کے دربار تک پہنچے
زباں چپ تھی
مگر آنکھیں

کہانی، عظمتِ سبطِ رسالت کی سُناتی تھیں

آنکھیں کس کی تھیں، رسالت کی نشانی آنکھیں
خون اُتر جائے تو بس لعلِ یمانی آنکھیں
آبِ شمشیر کہ دریا کی روانی آنکھیں
مینک آبی سے کہاں مانگتیں پانی آنکھیں

ہونٹ پیا سے تھے ادھر اور تھیں پیاسی آنکھیں
اُس طرف خون کی پیاسی تھیں پیاسی آنکھیں

آپ نمکین میں گھلتی تھیں ہزاروں آنکھیں
 خونِ اَبیض میں بھی دھلتی تھیں ہزاروں آنکھیں
 دل کی میزان پہ تلتی تھیں ہزاروں آنکھیں
 ہر خطِ جسم پہ گھلتی تھیں ہزاروں آنکھیں

آنکھیں تحریر بھی، تفسیر بھی، تصویر بھی تھیں
 آنکھیں سرکار کے اک خواب کی تعبیر بھی تھیں

انجیر کا پستّا

کسے ہے ہوش "کُن" کا
 صرف اتنا جانتے ہیں ہم
 بدن کنگے تھے

جب انجیر کے پتوں کے نیچے
 ٹنکیلے تیز پتھر ہاتھ میں تھے
 نرم پتھر کٹتے جاتے تھے
 چھناکوں کا تسلسل
 سروں کے پھول

کانوں میں مہکتے تھے

نگاہوں پر، لبوں پر اور سوچوں پر بھی

پابندی نہیں تھی

خوشی سچی خوشی تھی

غم برابر اشک بنتا تھا

تصنع کے قدم

ذہنوں، دلوں کی عنبریں دہلیز تک

پہنچے نہ تھے

ابلیس نے

تقسیم پر

آدم کو اکسایا نہ تھا

صدا ہے جلوۂ برقِ فنا

سِننے میں اک نغمہ دیکھا
 آوازوں کی دھنک بچھی تھی
 جھیلوں کے اطراف چنار
 برف کے تودے

اور

شگافوں میں بہراتے ناگوں کے بھین
 ہونٹوں کو ڈس لیں
 تو لاکھوں نغمے پھوٹیں
 کانوں کو چھولیں
 تو سُننے کی شکتی مل جائے

میں نے سارے ناگوں کے گچھوں کو اٹھا کر

اپنے بدن پر ڈال لیا

سارا زہر نکال لیا

اب تو میں

ہر نغمے کو

اپنے ہر بن مو سے سن سکتا ہوں

چھو سکتا ہوں

چکھ سکتا ہوں

پلکوں میں چھپا کر رکھ سکتا ہوں

یا کسیج

(لفظ کی فکریاد)

دُکھ سُکھ، فاقے، بدستی
دریا، صحرا، چیونٹی، ہاتھی
نابینائی، رازِ بصیرت
خوف و نفرت، زادِ سفر

میری کہانی پڑھنے والے
میرے شکستہ اعضاء کو کیوں جوڑیں گے
میرے فن کی لاش
کہاں پہچانیں گے

شکلیں کیسی بگڑی ہیں
ہاتھ نہیں یا پاؤں نہیں
یا آنکھ نہیں

کیا لفظ بھی انساں جیسے ہیں
کیا قبروں اور کستانوں میں
کچھ فرق نہیں؟

گیندیں

گیندیں روز اُچھلتی ہیں
 کرکٹ کے میدان سے لے کر
 گھر کے ٹیبل ٹینس تک
 گیندیں گویا
 ڈوبتے سورج کی تھالی
 چاند کی ساسر
 سونا، چاندی، تانبا، پیتل
 لکڑی، کاٹن، ریشم کی
 دست بدست
 بلند و پست
 ان کی قیمت ---

 دو آنے سے تاج محل تک

لکیر مت پٹیو

گُنّویں کے مینڈک

گُنّویں کے اندر

فضا کی سانسوں سے لے کے تیشے

ادھورے پیکر تراشتے ہیں

روایتوں میں اسیر ہیں یہ

نظر میں ان کی

نڈی کی وادی میں سیرِ چشمِ گرسنگی ہی

سُخن کی جاں ہے

سُنا ہے مغرب میں جب ہو برسات بے محابا

تو اندھی تقلید کے یہ رسیا

دیارِ مشرق میں چھتریاں اپنی کھولتے ہیں
 غرورِ اس کا ہے اُن کو ہر دم
 کٹی ہوئی انگلیوں سے اپنی
 قلم پکڑ کر
 شبیہ جذبات و شوقِ پنہاں
 بیاضِ دل پر اُتارتے ہیں
 غرورِ اس کا ہے اُن کو ہر دم
 افق کے جھولوں میں
 نیم بہروں کو بند کر کے
 کلی کی چیخیں، گلوں کی سانسیں
 صریحِ خامہ میں قید کر کے
 سنا سکے ہیں
 قلم سے عالم کو قتل کرنا ہے اُن کا مسلک
 قلم کی نِب، روشنائی ساری
 کسی دُکاں سے نظر بچا کر
 اڑا کے لائے ہیں تیرگی میں
 سخن کے یہ ناخدا جب اُردو میں بولتے ہیں
 مَرَضِ نستی کو سکونِ اوسط میں تولتے ہیں

پڑھیں نہ لکھیں

مگر تخلصِ لغت پہ بھاری

حسد کے کچ فہمیوں کے ایندھن

تنویرِ احساسِ کمتری کے

نظر پہ مہرِ لبوں پہ مہرِ دلوں پہ مہرِ

یہ تیر و شمشیر

میوزیم کے حسین شوکیں میں بھلے ہیں

یہاں تو ایٹم کی بات کیجے

بڑے تکبر سے تمکنت سے

اٹھا کے گردن

حروفِ ابجد کا ورد کر کے

سمجھتے ہیں فلسفہ سنا یا

غیاثِ میری یہ آرزو ہے

وہ میرے ادراک کے سہارے

گنوں سے باہر نکل کے دیکھیں

سخن کی دنیا میں وسعتوں کو

سخن کی آنکھوں میں حیرتوں کو

قناعت؟

اخباروں میں سب سے پہلے
مُشاعروں میں سب کے بعد

میرا نام

اکثر آتا ہے

میں اپنی اس عظمت پر

کتنا نازاں ہوں !

کتنے مُعنیؔ، کتنے مراثی

میری غزلیں گاتے ہیں

میں اپنی اس رفعت پر

کتنا قانع ہوں !!

احساس کمتری

شاید اپنی چھوٹی سی کمزوری سے

وہ واقف ہے

آئینہ در آئینہ

رپ سخی نے

اس کو دونوں ہاتھ دیئے ہیں

لیکن وہ تو

کسی سمے بھی

کسی بشر کو

کرتا نہیں سلام، نمستے

کمزوروں کے

ہاتھوں کو اور ماتھوں کو

تنگتا رہتا ہے

پروفیسر گھوٹی سہائے فراق گورکھپوری

اور
ڈاکٹر وحید اختر کے نام

غزلیں

وہ قتل ہو کے بھی فصلیں نئی اگاتا ہے
لہو کی جھیل میں صدیوں کے بیج ڈال گیا

(غیاث صدیقی)



سنا، میں ہوں پیدائشی بدشگون
نہ آنکھوں کی ٹھنڈک نہ دل کا سکون

مُصوّر سے پوچھا ہے تصویر نے
تری انگلیوں سے ٹپکتا ہے خون

ارادہ عمل کا نیا نام تھا
ازل کی جبین پر ملے "کاف نوں"

یہ پتھر ترے گھر کی بنیاد ہیں
ترے کام آئے گا میرا جنون

سمندر پہ بہتا ہوا ایک جھوٹ
سنا، بن گیا ساحلوں کا سکون

پسینوں کے جاذب کرنسی کے نوٹ
اُڑیں کالے گھوڑے چلے مانسون

سفارش کی کیلیں نہتے دماغ
حقارت کے سر تھے ہمارے قرون

سنے اُس کی جرأت کے قصے بہت
تو خنجر پہ نکلا کبوتر کا خون

مجھے برف کی وادیوں میں ملا
ملائم، گلابی سا، کشمیری اُون

صنوبر کے سائے میں خوش ہے غیاث
ترستے ہیں چھت کو ہوس کے ستون



تَقَا طُرُ سے پلکوں کے، جی ہے نڈھال
اُڑا قہقہہ اک دھنک پھر اُچھال

پرو بال یا رب، جوابوں کے دے
مجھے گھیر لیں گے، سوالوں کے جال

دبے پاؤں آکر نہ جا، اے بہار
اک آئینہ رکھ، رو بروئے غزال

دکھا دوستی کے بھی جو ہر دکھا
نکال آستیں سے تو خنجر نکال

بڑے ناز سے دل نے پکڑا کیا
ہوا متل آکر لبوں پر سوال

کہاں ملتے ساحل پہ ٹکڑے ترے
تو دریا میں ڈوبا بچپا بال بال



وہ آیا، کھل کے ملا، دل کا سب ملا گیا

وہ بُت تراش مجھے صورتوں میں ڈھال گیا

وہ قتل ہو کے بھی فصلیں نئی اُگاتا ہے

لہو کی جھیل میں صدیوں کے بیج ڈال گیا

میں بہہ چلا تھا انا کے حسین دھارے میں

دکھا کے آئینہ کوئی مجھے سنبھال گیا

میں یاد آیا تو بے دست و پا ہوا وہ بھی

مصیبت آئی تو اکثر وہ ہنس کے ٹال گیا

یہ مسئلہ کہ حقیقت جواب سے کم تھی
تمہارے سامنے کیوں صورتِ سوال گیا

کوئی ندیدہ سخنور غزل کے کوچے میں
بزورِ علم در آیا تھا، پائمال گیا

وہ گہرا پانی تھا، غواص کی پرکھ تھی اُسے
جتن ہزار کئے، سطح پر اُچھال گیا

خود اپنے گھر میں خود اپنا گلہ میں کیا کرتا
ہزار بار وہ آیا، مگر میں ٹال گیا

میں آس پاس کی تاریکیوں میں گم تھا غیاث
دک دک کے کوئی شعلہ جمال گیا



ہر طرف شور اُٹھا، آگ لگی، آگ لگی
اشک سمجھے تھے جسے ہم، وہ شرار نکلا

عکس دریا میں ترا دیکھ کے میں غرق ہوا
دشمن جاں تو مری جان سے پیارا نکلا

نہ ملا وہ جسے احساس کی منزل کہتے
یوں تو ہر موج میں پوشیدہ کنار نکلا

پلکیں بھینگیں جو تری، میں بھی ندامت سے بچا
ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا نکلا

آگئے راہ پہ سب رات کے بھولے بھٹکے
آپ کے ماتھے پہ جب صبح کا تارا نکلا

یہی تہذیب و روایت ہے وطن میں اپنے
غیر کے ہاتھ کٹے، خون ہمارا نکلا



کوئی گُل دل کے آس پاس رہے
رنگ اُڑے پیرہن میں باس رہے

چلے دریا کی دوسری جانب
اک کنارہ اگر اُداس رہے

لفظ مت پھینکے، چلائیے تیر
آرزو وہ بوجے لباس رہے

ڈاکٹر زینت ساجدہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ ڈاکٹر سیدہ جعفر جیلانی بانو

کرشن چندا اور اقبال متین کے نام

درونِ خانہ

.... لوری

.... بھیکا آٹا

.... اور وہ نغموں پر مرتی تھی

سوئی اور گلاب

تھکن

انمول انگوٹھی

چارشتیں

بوڑھا رامیا

لوری

سو جا مئے، سو جا
 کل سے اپنے گھر میں
 کتنے فاقوں کی مہمانی ہے
 عجبو، سَلَو
 ہمسایوں سے مانگی پیچ
 پیسے سوئے ہیں

تیرے ابا گب سے
 چھو لوں کی چادر کے نیچے
 مٹی کے بے نور مکاں میں
 سب سے رُوٹھ کے

سُٹتے گلتے جسم کو پہنے
سوئے ہوئے ہیں

دودھ کہاں سے لاؤں مُٹے
میں نر بل ہوں، تو کو مل ہے
کون ہمارا والی
عمرِ ختم ہیں
گانڈھی بھی نہیں ہے
دروازوں پر

دونوں کی دستک بھی نہیں ہے

..... اور وہ نغموں پر مرتی تھی

اُٹنا جب دفتر کو جانے گھر سے نکلتی

روز اُسے بس میں اک اندھا

سجاسجایا ملتا

نیلا سٹوٹ، کالی عینک، نارنجی ٹائی

کوٹھی سے پالی ٹکنک تک

چُپ چُپ سا وہ رہتا

بس جب تھوڑی آگے جاتی

بیگ سے اپنے، بانسری لے کر

نغموں کے پیالے چھلکاتا

کنڈکٹر بھی، پاسنجر بھی، ڈرائیور بھی

سب اُس کے نغموں میں جیسے کھو جاتے

راہ میں اک ویران جگہ پر بس رکتی

وہ اندھا چُپ چُپ اُتر کر چل دیتا

روز کا یہ معمول تھا گویا

روز ہی اُوشا سوچتی اُس کے بارے میں

اُوشا کے پیچھے بیٹھی اک لڑکی نے

اُوشا سے پوچھا

”اندھے کے بارے میں تم کیا جانتے ہو“

پھر خود ہی بھگی آنکھوں سے وہ پھلک پڑی

”یہ اندھا میرا بھتیجا ہے“

اُس کی محبوبہ

بس میں جل کر راکھ ہوئی تھی

دیا سلائی نے ساری کے آنچل کو چوما

دونوں آگ میں ڈوب گئے

ہاسٹل سے دونوں نکلے

یہ اندھا تھا، وہ مردہ تھی

یہ نمنوں کا خالق تھا

اور وہ نمنوں پر مرتی تھی

بھیکا آٹا

چند ریکا کی شادی کو دو ماہ ہوئے تھے

چند ریکا جاگ اٹھی سویرے

بلاؤز کے ٹکس لگائے

بالوں کو سمیٹا، جوڑا بنایا

ساری کو کچھ درست کیا

چیل پہنی، انگریزی

پڈ پر سوئے اپنے پتی کو

مُسکا مُسکا کر دیکھا

پھر ہاتھ منہ دھو کر کنکھی کی

اُتیرن پہنا

کچن کا دروازہ کھولا

آٹا بھگویا

آٹا گوندتے وقت اُسے کچھ یاد آیا

وہ ہنسنے لگی

پھر زور زور سے ہنسنے لگی

پھر اُس کے پی کی آٹکھ کھلی

وہ دوڑا دوڑا آیا

چندریکا کو کچن میں ہنستے دیکھا

چندریکا نے اس کو اپنے پاس بلایا

بھیگے آٹے میں لت پت اپنے ہاتھ دکھائے

لچک کے بولی ”چولھا سلگا دو“

سوئی — اور گلاب

ویسے سب جاتا گھر سے نکل کر

کالچ جاتی

راہ میں سوئی پھولوں کی دوکان سجائے

بیٹھا رہتا

رکشہ رکتی ایک منٹ کو

”ایک گلاب؟“

”چار آنے“ لے لو

جوڑے میں رونق آ جاتی

پھولوں کے ڈھیر لگے

پھولوں کے کتنے ہار بنے

بارہ مہینے، بارہ میگ بن کر گزرے

اور سب جاتا، بی، اے نے

ماتا پتا کے آگے اپنا ہاتھ بچھایا

مہندی کی گُل کاری دیکھی
 ہتھیلیوں نے ماتلوؤں نے
 شہنائی ابھی بجنے بھی نہ پائی
 دُلہا والے نقدی کم ملنے پر
 تھوڑا رُوٹھ گئے

پھر بات بڑھی
 پھر نوٹ گئی بارات
 اور سجاتا کے آنسو
 بی، اے کی ڈگری کو دھو کر بہنے لگے
 اتنے میں لوگوں نے دیکھا
 سونی کے دو ہاتھ بڑھے
 موٹا تازہ ہار گلابوں کا لہرایا
 اور سجاتا کی گردن میں
 جھول گیا

اور سجاتا کے چرنوں میں
 دھیر پڑے تھے چوٹیوں کے

تھکن

گیا رہ بجے وہ دفتر کو پہنچی تھی
 میلے کپڑے، پانی، جلتی دھوپ
 وہ گھر میں چھوڑ آئی تھی

سوچ رہی تھی
 کاشش، وہ من بھر دھوپ
 مُقَفِّل کمرے میں لٹکا کر آتی

پانچ بجے جب گھر لوٹے گی
 پانی دھوپ کہاں کھو جائے گی
 صرف تھکن رہ جائے گی

انمول انگوٹھی

ریحانہ کا چا چا آیا

ارضِ عرب سے اتنی ساری چیزیں لایا

ٹیمپ رکارڈر، دستی گھڑیاں

پاتا بے، لائٹر، فاؤنٹین پن

ڈھیروں کپڑے

سامن، ساڈن، ہیرنگ، ٹانی

چیز، مہنی، کھجور کے ڈبے

میٹھی خوشبو والے سینٹ

کتنے قصے لایا

اُس کے گھر میں

بکری، بندر، مرغی، کبوتر

ٹھنڈے کرے، لمبی موٹر

ان کے علاوہ

أَنْتَ ، أَنْتُمْ بولتے بچے

صبح، گجر دم، ننھے ننھے ہاتھ دُعا کو اُٹھتے ہوں گے

قرآن، الحَنُّ سے، سنتے سناتے ہوں گے

جیسے شہید ملائی کھائیں

ویسے اُن کی آپس کی ساری باتیں بھی

”قَالَ، قَالُوا“ آیت جیسی لگتی ہوں گی

ریحانہ کے ابا، امی

ریحانہ کے چا چا کو دل میں رکھتے تھے

چا چا نے چاچی کو

چھوٹے موٹے خط بھی لکھے، تار بھی بھیجے

ریحانہ نے اک دن دیکھا

”چا چا، ابا گلے ملے تھے

چا چا، ابا، امی

کھس پھس باتیں کرتے رہے تھے

دوسرے دن

پھوپھو، پھوپا، دادی، نانی

خالہ خالو آئے

امی ابّا نے سب کی دعوت کی

چاچا نے سب سے ہاتھ ملایا

میوے، مٹھائی، گھر گھر میں تقسیم کئے

سارا گھر کا گھر، خوش خوش تھا

سونے کی انمول انگوٹھی

میری انگلی میں پہنادی

میں خوش بھی تھی، حیراں بھی تھی

پھر بابا نے مجھ کو پکارا "تَعَالَ يَا بِنْت"

سب ہنسنے لگے، پھر میں بھی ہنسی

پھر مجھ سے بڑی آپی نے کہا

تو بہو بنی ہے چاچا کی

میں بھاگی بھاگی اپنے کمرے میں پہنچی

سب سے پہلے آئینے میں اپنی صورت دیکھی

پھر صوفے پر بیٹھ گئی

سوچ رہی تھی

چاچا کا بیٹا کیسا ہوگا

ویسے فوٹو میں نے دیکھا تھا

وہ عَرَبی فَنَ فَنَ بولے گا

میں فَنَ فَنَ انگریزی بولوں

جب تک وہ قرآن پڑھے گا

میں انڈے تل ڈالوں گی

تو بس بھی سینک رکھوں گی

مکھن کے لیپ لگا دوں گی

اُس کے میز پر آنے تک

میں ٹی وی دیکھوں گی

پھر میں نے یہ بھی سوچا

چاچا کا بیٹا خوب کما تا ہوگا

چاچا سے اجازت لے کر

اپنے بھاگ متی کے پیارے وطن میں

اپنے لوگوں کو تحفے بھیجوں گی

ان کو اپنے دو جے وطن بلواؤں گی

پھر اپنے ٹھنڈے کمرے میں

سب کو ٹی دی دکھاؤں گی

پھر میں نے یہ بھی سوچا

چا چا کا بیٹا کار تو تیز چلاتا ہوگا

میں ڈرتی بھی ہوں

خوش بھی ہوتی ہوں

ابا تو دھیرے دھیرے کار چلاتے ہیں

اور میرا دم گھٹتا ہے“

چار نشستیں

ہم سب کل پکچر کو گئے تھے

پہلی سیٹ پہ وہ تھی

دوسری سیٹ پہ میں تھا

تیسری سیٹ پہ میری ریحانہ بیٹھی تھی

چوتھی سیٹ پہ وہ تھا

تاریکی ماحول پہ چھائی

پکچر میں ہیروئن اٹھلائی

بائیں جانب سے اک پکیٹ کا جو کا لہرایا

اک ہاتھ بڑھا
انگارہ

جیسے میری ہتھیلی میں اُگ آیا
کتنی حسیں ہیر و ن تھی وہ
آج سے پہلے بھی تو یہی پچر دیکھی تھی
لیکن آج کی بات الگ تھی

میں نے دائیں جانب دیکھا
اُس نے کیسڈبری کا پیکٹ
ریحانہ کی سمت بڑھایا
ریحانہ نے پیکٹ لے کر
میرے دائیں ہاتھ پہ رکھا
برف کا ٹکڑا

میرا ہتھیلی میں اُگ آیا
ہیر و ن کا چہرہ
مجھے جھڈا سا لگا

رامیّا نے دروازے کی آڑ سے سب کچھ دیکھا تھا

اُن داتا نے رانی کو سینے سے لگایا

اور — کسی نے رامیّا کا کان پکڑ کر

اس کو وہاں سے پھینک دیا تھا

اُن داتا اور رانی دھن

سرد محل کے حوض میں پیرا کی کرتے

باغ میں رائیڈنگ بھی ہوتی تھی

اک دن رامیّا نے دیکھا

اُن داتا نے رانی دھن کو

چمڑے کے چابک سے اتنا مارا اتنا پیٹا

وہ گر کر بے ہوش ہوئی تھیں

پھر رانی کے میکے سے کچھ لوگ بھی آئے

میکے سے وہ پھر نہیں لوٹیں

رامیّا نے پھر دیکھا

اُن داتا نے دوجی شادی کی

پھر ہیروں کا ہار گلے کا پھندا بنا

رامیا کی موچھوں میں بھی

تھوڑی سفیدی آنے لگی تھی

اُن داتا کے محل میں

کتنی رائیاں آئیں کتنی گئیں کچھ یاد نہ تھا

رامیا نے اک دن دیکھا

اُن داتا کی چٹاپہ رونے والی آنکھیں سہمی ہوئی تھیں

جیسے اگر آنسو نہ بہیں تو چمڑے کا چابک برسے گا

سرکاری وردی پہنے لوگوں نے آکر

سارے محل میں قفل لگائے

سارے چمن ویران ہوئے

سارے نوکر بھاگ گئے

رامیا بھی محل کے پیچھے اک کُٹیا میں رہنے لگا

اُن داتا کا چھوٹا لڑکا مکتب کو پیدل جاتا تھا

اُن داتا کی آخری چھوٹی رانی

اب تو بوڑھی لگتی تھی

لڑکا چھوٹے مکتب سے کالج کو گیا

ماں بیٹے پیلس کے اک گوشے میں

چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے

لڑکے نے کالج سے ڈگری لی

کالا کوٹ پہن کے وہ تو روز عدالت جانے لگا

پھر رامپانے دیکھا

سارے محل کے قفل کھلے

پیلس میں آنکھوں کا

سرکاری دواخانہ آیا

محل کے گوشے میں بھی بہاریں آنے لگیں

زرگس کا اک تختہ تھا

بیچ میں آن داتا کالڑکا، اس کی پتی

سبزے پر لیٹے تھے

رامپا آنکھوں میں دوا ڈلوا کے وہاں سے لوٹ رہا تھا

رامپا کی بوڑھی پلکوں نے دیکھا

چمڑے کا چابک سرگل کرکونے میں پڑا تھا

اس چابک پر پھول چنبیلی کے منڈوے سے گرتے تھے

پیچھے اک دالان نیا تعمیر ہوا تھا
 دیواروں پر دُعا دھن کی، گاندھی جی کی
 تصویریں آویزاں تھیں
 سب سے اُوپر بنسی والے کا فوٹو تھا
 رامپانے سر کو جھکایا
 اور خوشی کے دو آنسو
 بوڑھی پلکوں سے ٹپکے

دکن کا پکاسو

(سعید بن محمد نقاش)

نقطے، نقطے، نقطے

کتنی لکیریں، کتنے دائرے، کتنے مثلث
کتنے رنگ

سیہ قلم سے ٹپک پڑی ہے
قوس قزح

شعر کا فن، نغمے کا بدن

یا خوشبو کا پیراہن
لؤلؤ، مرجاں

ہیرے، نیلم
بولتے جسم

سب کچھ چار لکیروں میں

مغرب کی جانب مت دیکھو

مشرق سے سورج نکلا ہے

سیر و فیض صیب الرحمن اور سیر و فیض ہارون خاں شیروانی کی نذر

ترجمہ

سیر و شلم کے نغمے (عربی) — ایک عاتق شاعر

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد (انگریزی) راجکماری انند رادیوی دھن راج گہر

تم (سنگو) جی ششدر شرما

یروشلم کے نغمے

(عراقی شاعری عسری نظم کا ترجمہ)

(پہلا گیت)

یروشلم میرے بغداد کے گھر کا ایک جمن ہے

یروشلم ایک کھلی کتاب ہے

جو خوابوں میں بھی پڑھی جاتی ہے

یروشلم میرا شہر ہے

آزاد نظم ہے

امن کا نام ہے

ایک جنگ ہے

جو مستقبل کی تعمیر کے لئے لڑی گئی ہے

یروشلم ایک پُل صراط ہے

جو خدا سے مجھ تک پہنچتا ہے

یروشلم میں ہوں

(دُوسرا گیت)

ایک شاہیں طوفانوں کی وادیوں میں

گہری نیند سوتا ہے

اس کا بدن

تیز ہواؤں کی مانند سبک

اور دشمنوں پر جھپٹنے والا ہے

میں طوفانوں کی وادیوں میں

گھومتا پھرتا ہوں

جنگ کی لغت میں اس کو تلاش کرتا ہوں

اُس کو — جو آج یہاں نہیں ہے

وہ آتا ہے

اور طوفانوں کا جامِ صحت

ہونتوں سے لگاتا ہے

میں نظیں لکھتا ہوں اس سر زمین کے لئے

جن کو طوفان بہا لے گئے

ہوائی قلعوں کے میں خواب اکٹھے کرتا ہوں
 کیا یہ شاہین اک صنفِ نازک ہے
 جو طوفانوں کی ساتھی ہے
 جو طوفانوں کے بچوں سے باتیں کرتی ہے
 اے نازنین

میں تمہاری ان مسرتوں کو تسلیم کرتا ہوں
 جن کے بل تم سر بلند ہوئی ہو
 کیا تم میرے غموں سے واقف ہو
 جو میری اُفتاد کا باعث بنے
 شجر گاتے ہیں

سمندروں کے بالک

چاندنی کی اُور غوطے لگاتے ہیں
 آؤ، تاریخ کے اجنبی سے پوچھو
 کس قوت کی جیت ہے

خیالات کے سارن بجنے لگتے ہیں
 اور شاعر لفظوں کے شفا خانے میں داخل ہوتا ہے

بربریت جنگ کرنے کو نکلتی ہے
 اور اسرائیل اس دہلیز پر مر جاتا ہے
 اسرائیل ٹکڑے کیا ہوا ایک گھوڑا ہے
 جو انقلاب کی رات میں
 آنکھوں کو بند کر لیتا ہے
 دروازے جو امن کی دلدل کی طرف کھلتے ہیں
 ایک خنجر میرے دل میں ڈوبتا ہے
 اور نشانہ چوکتا ہے
 اے میرے لوگو، اے میرے ساتھیو
 وقت میری طرف آ رہا ہے
 بند شہروں سے
 چہروں پر موت کی نقابیں
 پیار کے لئے کھاد
 خوشی کے لئے شجر
 موجیں کون سا گیت کناروں کو سناسکتی ہیں
 گندک کے پتھر

دُنیا کی ریت پر آہیں بکھیرتے ہیں
لباسِ شب میں جنگلِ خوبصورت ہے
موجوں کے چہرے پر

وہ ہنستا ہے
افسوس میں دیکھتا ہوں

یہ امن نہیں ہے

یہ دارالسلطنت ہے

سنہرے بالوں کا بچہ ہے

جو رو رہا ہے اور لفظوں کو تقسیم کر رہا ہے

میرے اجداد کا دم گھونٹنے والی خاموشی

اپنے بزرگوں کی ہنسی میں پاتا ہوں

کیا میں اس سمندر کو گرفت میں لینے کی جرأت کر سکتا ہوں

اور لہروں کے ماضی میں سفر کرنے کی جسارت کر سکتا ہوں

رات کی رات میں

میرے بدن سے ایک سُورج چھوٹا ہے

گھنٹیوں کی آواز اور سمندروں کا شباب میرے ساتھ ہے

ہرک کے اڑتے ہوئے بادبانوں میں
 میں اپنی آواز کو سُن رہا ہوں
 طوفان جیسے جنگل میں کسی راکشس کی آنکھیں
 میں خواب میں جنگل اور سمندر دیکھ رہا ہوں
 اے میرے عہد کے کنارے
 اے طوفانوں میں چمکنے والی رانی
 میں طوفانوں کے لئے کہاں اپنا ہاتھ بڑھاؤں
 کناروں پر نسلیں غصے میں اُبل رہی ہیں
 اور طوفانوں کی مشینوں میں ہل جل رہی ہیں
 ان طوفانوں میں ہمدم اور ساتھی
 قوتِ فیصلہ کھوئے ہوئے سامنے کھڑے ہیں
 اور اس طوفان میں
 میرے شانوں پر ایک بارِ گراں بن گئے ہیں

(تیسرا گیت)

اب رات بادشاہ کے حرم میں پہنچ چکی ہے

اور دوب پر صرصر گاتی ہیں

اے مرے وطن

اے مرے یر و شلم کی آزادی

ماتمی مکرے میں ڈوبتا ہوا چاند

تمہاری موت چمکتی ہے وقت کی شاخوں کے درمیان

میرے گلے میں طوق کی مانند روشن ہے

میرے دیوان کے اوراق پر روشن ہے

میری پہلی محبت میں ابھرتا ہے

اے مرے وطن

رات، محبت کے تیسرے ملک کو اڑ کر پہنچتی ہے

میں جنگ کو نکلتا ہوں سورج کے ہمراہ

اور موسیٰؑ کی آنکھوں سے پی کر مست ہو جاتا ہوں

میں ہوں سینائی

میں اپنی آواز کا قیدی ہوں

میں جنگ کے لئے کیسے گاؤں اور کیا گاؤں ؟

صحرا میرے آگے بچھا ہوا ہے

میں شکست خوردہ شہروں کی راتوں سے گزر جاتا ہوں
 میری کلاہ پر خطابات، سورج
 امن، وادی میں پکار رہا ہے
 میں ماضی کا عطر سونگھتا ہوں
 میں اپنوں کا ذکر کرتا ہوں
 جو ایک ساحل پر طائر کی مانند خوش ہیں
 جیسے حاملہ ایام قتل کے کمروں میں گزرتے ہیں
 میں جنگ کو پوجتا ہوں
 کیا تم یہودی ہو
 میرے دیوتا خشک سمندروں میں
 دُور سے دُور ہو جاتے ہیں
 میں اپنے کندھوں پر لنگر اٹھاتا ہوں
 میرے پاس ہواؤں کی بندرگاہ ہے
 اور رستم کی نظمیں
 میرا کارواں ندیوں سے اُترا ہے
 وقت کا سپہ سالار، شاخوں کے پیچھے

عرفات یا سر عرفات

میں انقلاب کی آوازوں میں ڈوبتا ہوں
میں آنکھیں بند کر کے جنگ پر جانا قبول کرتا ہوں
جیسے امن میرے ساتھ ہو

رات سورج کے بادشاہ کے حضور آتی ہے

جو اپنے وجود سے باہر ہے

میں تمہاری آواز سننا ہوں

اے محبت کے طفل نابالغ

اے عمر ابن الحتم

سات روز کی جنگ میں

دریا

عربی زبان اور صحرا سے واقف ہو چکا ہے

میں لوٹتا ہوں اس سورج کی حضوری میں

چھ دن کی جنگ میں

آزادی کا سورج

میرے آسمانوں میں نکل آیا ہے

چوتھا گیت

جب انھوں نے میرے شہروں پر حملہ کر دیا

ان کی زبان اور جنگ کی زبان نے

میرے کانوں کو چھید دیا

مگر میں سمندر ہوں

ہمیشہ دُور اور پہنچ سے باہر

شہیدوں کے جزیروں میں

میرے ہاتھ

قاتلوں کو، سانسوں کی دان دیتے ہیں

اور میں ان کے ساتھ

لٹ پٹ راہوں پر چلتا ہوں

اپنے ساتھیوں کو پیار کرتا ہوں

جو جنگ سے نفرت کرتے ہیں

جو میرا خون ہیں

میرا وطن ایک آسمان ہے

جہاں طائر اور طیارے پرواز کرتے ہیں

میں بے دلی سے اور نا اُمیدی سے قتل کرتا رہا

میرے دردِ نہاں نے میری فریاد بند کر دی ہے

میں اکیلا ہو گیا سمندر اور مقتل کے سامنے

جزیرہ ماتموں کو پی گیا ہے

منتظر ہے تلوار کا

تاکہ وہ ندی کو پار کر لے

اور بے ہوش شہروں کو جگائے

جیسے ہوا، تھکے ماندے شہروں میں جان ڈال دیتی ہے

جب وہ میری قوت کو قتل کرنے لگے

اور میرے بعد مرنے لگے

میں نے محبت کے ہاتھوں کو پیچا نا

جیسے مجبور ہونٹ اعتراف کر لیں

میں وہ ناممکن انسان ہوں

جو وقت سے گزرتا ہے مقتل کی جانب

میں یر و شلم ہوں، مقتل بھی

میں محبت ہوں، مقتل بھی

میں جنگ ہوں، مقتل بھی

میں امن ہوں، مقتل بھی

میں ایک مجرّد نعرہ ہوں

میں یر و شلم ہوں

خواہ وہ کہیں بھی ہو

PARTINGS IN MEMOSA.

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد (غالب)

(انگریزی کی ممتاز شاعرہ راجکماری اندرا دیوی دھن راج گیر کی)

طویل نظم کے ترجمے سے کچھ حصے)

تم تنہا

ایک بُت ہو

جسے مَر مَر تلاش کرتا رہا

جستجو کی روشنی اُتری ہے

لا محدود گہرائیوں میں

جن پر پہنچوں کے نشان

خون کی لکیریں اُگلے ہیں

جہاں موتیا کا گہرا سسکیاں لیتا ہے

بے رنگ و بو کشتِ خواب پر
 دھیرے دھیرے بڑھتا ہے
 احساسِ دردِ نہاں
 سنگِ بدن میں دھنستا ہے
 اپا ہیج دکھ تراشتا ہے
 درد، آوازوں کے نشتروں کی مانند
 شکستہ صلیب کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں پر
 گھس گھس کر تیز ہو جاتا ہے
 اور آنسو

آنے والی سحر سے پہلے کی خاموشی کے دامن پر
 داغ ہیں

نظر افروز بہاروں کے نشیب و فراز
 زرقشاں موجوں پر
 ناخداے وقت کو
 آگے بڑھاتے ہیں

ساحل پر جو اُمیدیں

گلِ یاسیں سے چمٹی ہوئی تھیں
جھڑ گئی ہیں

صحنِ آرزو میں

وقت کی دُونے جیسی خوشبو

اُٹھ رہی ہے

دُکھ، صبح کی کھر کے دوش پر

پھر سُورتا ہے

دل کے ہنسون کو چھوئے کے لئے

نئی صبح کے بھیس میں

جیون چمک رہا ہے

جنم جنم کی خاک پر

آگے پیچھے

سرگوشی کرتے لمحات

جذبات کے طوفانی سمندروں میں

غوطہ زن ہیں

ماضی کے پھول کس قدر قریب آگئے ہیں

سرگوشی چبھتی ہے.....

.....

درد مجھریوں کی مانند
غم کے آتش رخساروں پر لوٹتا ہے
اور زندگی کی دودھاری تلوار پر

وقت پھر کٹ جاتا ہے

کہسارِ شام و سحر پر
پنچ رُس سُرخ عنبر چھڑکتا ہے
پریتوں کے پاؤں میں

زنجیریں کھنکھاتی ہیں.....

.....

یہ پھرا ہوا وقت

وجود کے سالیوں سے پہلے

آفرینش کے جھولوں کے قریب پہنچ کر

سنہرے خوابوں کا انتظار کرتا ہے

اور جوانی

آشکار سچائی کے درمیان

توہم کی کائنات میں

امیدوں کے پھول چنتے ہوئے

جیون کے شام و سحر کی تنگ راہوں سے نکل کر

امیدوں کے بیج کو

خون میں، تن من کی راکھ میں

جستجو کی ولدلوں میں

بودیتی ہے

پیام سنگر انداز ہیں

حروف بے آواز ہیں

.

دُوریوں کے لمبے پاؤں اب تو کاٹ ڈالو

اگر ہم پھر سے سو جائیں گے

آوازوں کے گھلنے تک

تویہ وقت اور سانپ

سازش کر لیں گے

راہیں پھر ڈسنے لگیں گی

ورنہ دقت کی باڑھ

ہمارے اوپر سے گزر جائے گی

اور نقوشِ قدم کو بھی بہا لے جائے گی

ناشناخت پر چھائیوں میں

دونوں کے بوسوں میں

کھو جائے گی

.....

آج میں

تنہا ہوں

جیسے کوئی دن، موتی کی مانند

ابدیت کی مالا سے ٹوٹ کر

الگ ہو گیا ہو

خون کی اک مُردہ آواز

کالی کالی تہی زنجیروں میں

آج بھی میرے ساتھ ساتھ روتی ہے

راستہ

سیرِ افعی کی طرح

دُور دُور تک کا سنی بھُور پھیلائے ہے

جس پر ہم اندھوں کی طرح ساتھ ساتھ چلتے ہیں

.

تم اب دُور ہو کہیں

جہاں موسموں کو زوال نہیں ہوتا

میرے خوابوں کو تم قطرہ قطرہ پیتے ہو

اشک و خون کے ہر دَورِ جام میں پیتے رہے ہو

خواب کی زنجیر ٹوٹتی ہے

جڑتی ہے

جیسے ہر رات کا پھول کھلتا ہے

جیسے حلقہٴ شباب میں موسم گھومتے ہیں

جہاں ہماری جدائی قدم بستہ ہے

.

ہماری وداع ٹوٹ کر

سرگوشی اور درد کا بوجھ بن جاتی ہے

بے دھار خنجر کے وار کو

ایک نرم پیخ قبول کر لیتی ہے

اور دونوں پتھر کے بدن سو جاتے ہیں

.

تم رو برو بھی اور عقب در عقب بھی موجود ہو

یہ دُوری

وقت کے ہونٹ ہیں

جو جھک کر میرے باطن کو چومتے ہیں

ہزاروں گھنٹیوں کی آوازوں میں

وقت

رخصتی آنکھوں سے جھانکتا ہے

ایک پُرسوزیاد

وقت کی شریانوں میں مچلتی ہے

خواہشوں کی صُبح

نئے جنم کی چٹانوں پر چھلک رہی ہے

اس پرندے کی طرح

جو ایک شب خاک بن جاتا ہے

پھر دوسری شب

اُسی خاک سے

پرندہ بن کر اُڑنے لگتا ہے

دُوریوں کے سینے میں بھی ایک وقت تھا

شجرِ گل کے سایوں میں

جہاں ہم نے

کسی رات

حیات کے لباس اُتارے تھے

دہانِ زخم پر محبت کو چوما تھا

اور جیون کو

دودھیا کھرے کے دامن میں

چھوڑ دیا تھا

اب وہ زعفرانی دھندلکے میں

طلوع ہوگا

جیسے درد کا سفید طوفان

جو زندگی کے سنگِ درپر

بار بار جبیں گھستا ہے

سحرِ گل کی مینا کاری سے پرے

ہزاروں شاموں کے شہد اور گلابوں سے پرے

بجھتی ہوئی شمعوں کی روشنی سے پرے

ڈھلتی ہوئی شام کے اشاروں سے پرے

گہرے آسمانوں کی سحر سے لوٹو

جہاں زندگی لا محدود گہرائیوں کو چھوتی ہے

.

میری سانسوں میں خواب بھرے ہیں

اور اُن خوابوں میں بلبلِ تب ہوتی ہے

جب تمہاری آمد کے امکانات کی جوت

چھلک اُٹھتی ہے

.

اب رات کے سائے

چڑھتے بڑھتے

پُر درد نیلی راتوں میں

اپنا حق سمجھ کر

انگلیوں کو بڑھاتے ہیں

میرے کمرے کے دریچوں تک

پھر میرا وقت اور تمہارا وقت

جبروں کی مانند ملتے ہیں

تمہارے چلے جانے کے بعد

میں خوابوں کے تصور میں کھوئی رہی

.

پُرانی جدائیوں کے درد

نئی زندگیوں میں

پانی کی باڑھ کی طرح آتے ہیں

یادوں کا سونا

بہتی ہوئی صبا کو روک کر

اس کا منہ چوم لیتا ہے

جذبات کی شبنم کو
بے حرکت ریگِ صحرا چوس لیتی ہے

بار بار، سرد طوفانوں میں
اپنے آپ کو اکیلا پاتی ہوں
جس کی ہوس تھی تلاش تھی
وہ تو درد ہے

وقت ٹخم بھی ہے اور نمک بھی ہے
جو میموسا کی پہاڑیوں پر سرگوشیاں کرتا ہے . . .

.

چاروں طرف سے
جب گیت دوڑتے ہیں
مجھے احساس ہوتا ہے
کہ یہی تو منزل ہے
مگر، تحسین و آفریں کی صدائیں
بند ہو جاتی ہیں

جب میں تمہیں جاتا دیکھتی ہوں
 اور یاد کے سفید کپڑے میں
 تم کو تحلیل ہوتا ہوا دیکھتی ہوں
 جیسے جیون کے ساتوں رنگوں کو
 قوسِ قزح کے روپ میں
 میں نے کوٹا دیا ہے

.

وقت کی بالاسری بجتی ہے
 وادیوں کی بانہوں میں
 ایک گونگا درد
 سر پیٹتا ہے
 وقت کی موسیقی پر
 مرثیے اور پرہ کے گیت روتے ہیں
 اور آنسو
 ایک لنگڑی اُمید پر گر کر
 فنا ہو جاتے ہیں

ہم مر مر میں لحدوں میں
 حیات ڈھونڈتے ہیں

اور گُلِ اشترنی کو گلاب کے دھوکے میں چوم لیتے ہیں
 اور پھر حیات کا خنجر
 مشاہدہ و احساس میں اُتر جاتا ہے

.

میں اور تم
 وجود کا سامان لائے ہیں، سفینے لائے ہیں
 بادبان باندھیں گے اور منجدھار سے ساحلِ تنگ پہنچیں گے
 ہمارے تمام روز و شب صدف میں سو جائیں گے
 ریت کے دامن میں ایک دن

وقت

گلابی موتی بن کر جاگے گا
 تم مجھے اتنا چاہو میرے محبوب
 مجھے کسی اور محبت کی تمنا نہ رہے
 اور میرے ذہن کے گوشے میں
 کوئی آہٹ نہ سُنائی دے
 جب تم دُور ہوتے ہو
 تو رُفوکھل جاتے ہیں
 اور زخم کی آنکھ کچّا ہو جاتی ہے

م

(ممتاز تلگو شاعر شری جی شیشندر شرمانے یہ نظم ونیس ڈی میلو سے متاثر ہو کر
اکتوبر ۱۹۷۰ء میں بمقام روم کہی تھی)

کچھ تو بولو

میرے دیارِ چشم میں اک خواب

دھنک کی طرح بکھر گیا ہے

دھنک

جو دور آکاش کے کناروں سے

اُترتی معلوم ہوتی ہے

اُن ہونٹوں کو وا کرو

جو پھول کی پتیوں سے زیادہ حسین اور نازک ہیں

اے حُسن بے مثال
 میرے معصوم دل کی لہروں میں
 وقت کی مہکتی کیاریوں میں
 گہری نیند
 کتنے عِیکِ تم سوتی رہیں
 گلاب کھلے مُرجھائے
 خزاں کی نذر ہوئے
 لیکن تمہارے نازک چرنوں میں اُپن ہونے والے
 گلابوں کو لینے کے لئے
 کیوں نہیں آئیں

دیارِ روم میں تم کو دیکھا
 قدیم فن کی عظمت میں
 نقش و نگار کے آئینوں میں
 حسین محل کی چوکھٹ پر
 درختوں کی شاخوں کے پیچھے

دُور پہاڑیوں کے عقب میں

سایوں کی طرح

ماضی کے نقشِ ناخن کی مانند

تم ایک سَجلِ شام کی طرح سَنور کر آئی ہو

اور اپنے سَنگ

لمحہ گریزاں کے گلابوں کو

چرا کر لائی ہو

اے روم کے غروب ہونے والے آفتاب

میری آنکھوں میں

زرد تمناؤں کو تم نے

پرت پرت اُتار دیا ہے

جیسے

کسی مائیکل انجلو کے قلم سے

دھنک کے غم انگیز درد

ٹپک گئے ہوں

وہ آنکھیں

نیل گن کے ٹوٹے ہوئے دو ٹکڑے

دو اودے اودے پرندے

جیسے دو نیلم

پنکھ لگا کر اڑ جائیں

میں اُن میں

کہساروں پر گرنے والی برف

اور چاندنی کی ٹھنڈی مہک پاتا ہوں

جہاں مغرب کے کناروں میں ریت پر

انسانی فکر کی برسات ہوتی ہے

میں ان میں سلطنتوں اور شہروں کے

عروج و زوال دیکھتا ہوں

جو صدیوں کے طاقتور شاہوں پر

سو گئے ہیں

جب تم کو پایا

تو دنیا کو کھو بیٹھا
 نیند کی میٹھی جھیل میں
 ایک نازک خواب
 ہنس کی طرح بہنے لگا ہے
 دُور بہت دُور

میں آسمانوں کے نیلے ستاؤں میں کھو گیا تھا

اور جاگا ہوں
 اُفق کی بانہوں میں
 جذبات کے بگولے کی طرح
 میرے تختیل کو تم نے
 نئے پنکھ دیئے ہیں

نئی قوت پرواز دی ہے
 آخر کچھ تو بولو
 اس سے پہلے کہ یہ لمحہ شب
 گزر جائے

یہ رات

جس میں

آہیں بھرنے والے گلابوں کی سانسیں

ہم قدم ہیں، ہم نفس ہیں
کہو، تم کتنی راتیں

نقرومی چاندنی کی موجوں میں

نہا چکی ہو

کہو، بادِ صبا کی کتنی زلفیں

تمہارے مرمری شانوں کو چومتی ہوئی

انق میں گم ہو گئیں

کیا میں تمہارے صد لیں بدن پر

اپنے جلتے ہوئے ہونٹوں کے نقوش

چھوڑ سکتا ہوں

بس، یہ رات گزر جانے سے پہلے

دل کا بوجھ ہلکا کر ڈالو

کس آذر نے

کتنے پریم نگر
تمہاری آنکھوں میں
تراش ڈالے ہیں
کہو

کیا ان آنکھوں سے
تم دیکھ رہی تھیں

ساگروں کا، شہروں کا نشیب و فراز
جاگتے ڈوبتے سورج کے رنگین شانوں پر

وقت کا پیچھی اڑتا رہا، مسکراتا رہا
اُس وقت تم صورتِ سحرِ روشن تھیں
گلِ یاسمین کی طرح مہکتی تھیں

کتنے مسافر

اُمیدوں کی روشنیوں سے گزر گئے
کتنی آنکھوں میں تم نے

نرم، مہین اور ریشمی خوابوں کے دھاگوں سے
قول و قسم کے نشان

اور اُمیدوں کے نشیمن بنائے

آؤ مجھ سے کہہ ڈالو

اس سے پہلے کہ وقت کا کارواں

اور آخری رینگتا ہوا لمحہ

میری زندگی کے صحرا کو چھو لے

ادھر آؤ

تم پتھر نہیں ہو، خواب نہیں ہو

تو کیا تم ماہی خوش رنگ ہو

جو میرے پریم جال میں

ہمیشہ کے لئے آگئی ہو

تم ایک حسین حادثے کی جان ہو

جو میری ہزاروں رگوں میں

ایک آنکھ بن کر جاگ رہی ہو

میں کہ جسے

حادثہ زندگی نے

ریزوں میں بانٹ دیا تھا
 ایک اجنبی لمحے میں
 تم نے ان کو یک جان کر دیا
 اور میری زندگی پر
 سکون کی شبہم بر سائی

جب میری دو آنکھوں نے
 تم کو پرکھا
 اپنے احساس کی ان گنت انگلیوں سے چھوا
 تو تم نے

میری کوتاہی دامن میں
 سونے کے خزانے لٹا دیئے
 عشق اگر جیون کی مٹھاس ہے
 تو عاشق ایک پھول ہے
 میں وہ پھول ہوں

جسے تمہاری انگشتِ جنابت نے کھلایا ہے

تمہاری بائیں
کھیتوں پر رقص کرتی ہوئی چاندنی کی مانند
ملائم ہیں

مجھ پر ان بائیں میں کیا گزری
توسنو

جیسے اول اول
لپکتی ہوئی آگنی نے ریشیوں کو گیت دیئے تھے

میں ایک کرن کی تلاش میں
ایک نغمے کی لکیر پیٹتا ہوا
تم تک پہنچا ہوں

صدیوں کی شاعروں میں
نہاتا ہوا

اپنے آپ تک پہنچا ہوں

نذرِ وطن

اندر اجوتی

آزادیِ وطن

باندِ ڈلیر

حیاتِ مساوات

ایک خواب — ایک حقیقت

پٹنہ جو ایک شہر تھا بھارت میں انتخاب

مخدوم

اندرا جیوتی

(شرمیتی اندرا گاندھی کے نام)

ہر طرف گہری سیاہی چھا گئی ہے کیا کروں
 بھوک کی افلاس کی اور جہل کی بے روزگاری کی
 اور استحصال مذہب کا، زباں کا

بدترین ہنگام
 استعمال بے جا، خامہ بے روشنائی کا
 اور کلیدی عہدے اپنانے کا لالچ
 خرد کے ذہن میں بیٹھے ہیں ناگ
 ہاتھ میں شمشیر، آنکھوں میں ہیں شعلے

ہر طرف گہری سیاہی چھا گئی ہے

یا پھر ایسا ہے میں اُندھا ہو گیا ہوں
 اُندر اُجیوتی،

تنگ ذہنی کے، تعصب کے، تشدد کے
 لبادوں کو جلا دے

اور ہم کو
 برق آسا اک معطر چاندی
 کر دے عطا

جس کی ضو میں
 مُسکرائے مہکے
 بھارت کی جوانی کا گلاب

آزادی وطن

یہ ماہ و انجم کی بارگاہیں

شمیم گل، جانِ نغمہ

یہ چاندنی کی سپردگی بھی

یہ نوجوانی کی شہ رگیں بھی

دیارِ مغرب کے خونی ہاتھوں سے اپنی گردن

چھڑا رہی تھیں

گلابی چادر زمیں پہ بچھ کر

دھنک کا آنچل فلک پہ اڑ کر

وطن کو آزادی وطن کی بشارتیں

جیسے دے رہا تھا

وطن کی دھرتی کے ہونٹ پھیلے

یہ ہونٹ پیاسے تھے

اپنے بچوں کی شہ رگوں کو

تراش کر اُن پہ جم گئے تھے

سیاہ لب خون پی رہے تھے

سفید لب مسکرا رہے تھے

سفید ہونٹوں کی مسکراہٹ

بس ایک لمحے میں چیخ بن کر

سُکوت کی برف پی رہی تھی

اُنا کا سورج پگھل رہا تھا

محیطِ عالم کی تابناکی

ردائے مغرب میں گر کے

لمحہ بہ لمحہ تحلیل ہو رہی تھی

سلونی شاہیں

نگارِ مشرق کے گیسوؤں میں

مچل رہی تھیں
 کہ شانہ اُٹھے
 کہ مانگ نکلے
 کہ برق چمکے
 تو راستے کی لکیر پیٹیں
 شعور کھوجیں، ضمیر ڈھونڈیں
 خرد کی ڈھالیں
 جنوں کی شمشیریں لے کے اُٹھیں
 نگر نگر فستح کر لیں
 وطن کو
 محرومیوں سے، سازش سے
 پاک کر لیں

بائڈڈ لیبر (BONDED LABOUR)

(تحت معاہدہ استحصالِ مزدوری)

سوا سیر گیہوں کے بدلے
 دس ایکڑ کا کھیت دیا
 سات دہوں تک کر کے غلامی
 دو سو روپے اصل تھے باقی
 پہلے رہن تھا سونا چاندی
 بعد میں تانبہ پستل
 اس کے بعد انسانوں کی باری آئی

محنت کے ہاتھوں میں

زنجیریں پہنا دیں

محنت رہن ہوئی

بھارت کے یہ ناگ

اپنے سیہ پھنوں کو

لوہے کی، موٹی، کالی تجوریوں میں

چھپا رہے ہیں

بیس نکاتی فارمولے کا چوتھا خنجر

ان کے پھنوں میں

زہریلے زخموں کے سکتے

بھرنے والا ہے

یہ لو، سونے چاندی کی جلتی مٹرخ سلاخیں

ان کو اپنے منہ میں رکھ لو

ان سے اپنی آنکھیں سینگو

ہاتھوں کو تاپو

پیٹ بھر د

حیاتِ مساوات

جو لوگ قوم کے دشمن ہیں، ملک کے دشمن
چھپائے تیغِ قبا میں، جھکی ہوئی گردن

دلوں میں بغض ہے، لیکن کلام کرتے ہیں
شکن جبین کی دکھانے سلام کرتے ہیں

بنامِ مذہب و اخلاق، گل کھلاتے ہیں
زباں کے نام پہ انساں کاخوں بہاتے ہیں

فلک کو چھونے اٹھے ہیں، حقیر بونے ہیں
میں جانتا ہوں یہ ٹوٹے ہوئے کھلونے ہیں

دل کی جگہ ہیں سینوں میں روٹی کے ٹکڑے
 ہونٹوں پر روٹی کے ٹکڑے
 آنکھوں میں روٹی کے ٹکڑے
 دل کے ٹکڑے

چال سے استقلال نمایاں

ذہنوں میں ہیں

مستقبل کے، مبہم مبہم خواب پریشاں
 خواب پریشاں، ایک حقیقت، دورِ محبت، دورِ اخوت
 دھرتی پر مز دور حکومت
 ظلمت میں پُر نور حکومت

پٹنہ جو ایک شہر تھا بھارت میں انتخاب

کیا بود و باش پوچھو ہو پُورب کے ساکنو !
ہم کو عکسِ نیرِ جان کے، بھیا پکار کے
پٹنہ جو ایک شہر تھا بھارت میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
غرقاب کر کے سونے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے
جیتے ہیں، بس گزرتے ہیں دن انتظار کے
رات اختیار کی ہے، نہ دن اختیار کے

نقدی بھی بہہ گئی، بہہ کھاتے اُدھار کے
 ”گر“ سارے ہم تو جھول گئے کاروبار کے
 لٹکے ہوئے ہیں دیکھو، درختوں پہ سارے لوگ
 سارے مکان بہہ گئے قُرب و جوار کے
 جھوکے ہیں کب سے ہم کو تو کچھ یاد بھی نہیں
 لمحے رُکے پڑے ہیں ہمارے دیار کے
 کس کس طرح سے ٹوٹیں گے باغوں کے والیاں
 بہتے ہوئے کچھ آئے ہیں، دانے انار کے
 ہے یاد مجھ کو میں نے اُسے دی تھیں گالیاں
 جھوکی بھکارن آئی تھی دامن پسار کے
 بیٹھی ہے وہ مزے سے تناور درخت پر
 کھاتی ہے کھول کھول کے ڈبے تشار کے
 ڈبوں میں سوکھی روٹیاں، آچار، دال بھی
 یہ ”نعمتیں“ کہاں سے وہ لائی تھی مار کے
 آنکھوں میں آنسو آئے، مرے کپکپائے لب
 روٹی کا ٹکڑا مانگا جو میں نے پیکار کے

آچار میں بھگوئے ہوئے نرم چار تو س
 تحفے غریب کے تھے، محبت کے پیار کے
 وہ ہنس کے بولی، بھوک میں کیا کام آئے گی
 ہیرے کی میں نے دی جو انگوٹھی اُتار کے
 بھوکوں کو دیکھیو نہ حقارت سے صاحبو
 اُن کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
 عالم کے، جاہلوں کے، غریبوں کے، سیٹھ کے
 بھگوان ایک کے نہیں، وہ تو ہیں چار کے
 ہر شہر میں ندی کی ہے ناگن پڑی ہوئی
 پیتی ہے بادلوں کو فلک سے اُتار کے
 غصے میں آ کے زہر کے طوفاں اُگلتی ہے
 لٹتے ہیں جب غریب کسی بھی دیار کے
 لہجہ نظیر کا ہے، زمیں میر کی غیاث
 پٹنہ میں کھینچ لائیں گے ہم دن بہار کے

مخدوم

دوست روئے ہی رہیں گے بخدا تیرے بعد
 لبِ دشمن پہ تبسم نہ بلا تیرے بعد
 تو نہیں ہے تو ہر اک غیر نظر آتا ہے
 کس کو پہچانے غیاث اپنے سوا تیرے بعد